میں مذہب کے خانہ کے اندراج کے لیے وہ وزیرِ اعظم پاکستان اور دیگر متعلقہ حکام کو ہدایات جاری کریں گے۔"

صدرِ پاکستان کے متذکرہ بالا بیان سے پاکستان کے قوم پرست حلقوں اور خصوصاً اقلیتی حلقوں میں گہری تشویش کی لہر دوڑ گئی ہے کیوں کہ صدرِ پاکستان کا کہنا کہ "آئین کی رُو سے قومی تشخص کے ساتھ مسلم تشخص بھی ضروری ہے۔" پاکستان کے آئین کی من مانی تاویل قائداعظم کے نظریۂ پاکستان کی کُھلی خلاف ورزی کے مترادف ہے کیونکہ تشکیلِ پاکستان سے قبل اور پھر مابعد بابائے قوم نے پہلی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے جس نظریۂ پاکستان کی نشان دہی کی تھی اُس کے مطابق قوم کا تصور پاکستانی قوم کے حوالے سے پیش کیا تھا جس میں مسلم وغیر مسلم، ہندو اور غیر ہندو کی کوئی تخصیص روا نہیں رکھی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہے گا مسلمان، مسلمان نہیں رہے گا۔ مذہبی معنوں میں نہیں بلکہ ریاستی معنوں میں کیونکہ پاکستان کے تمام شہریوں کی شناخت پاکستان کے حوالے سے ہوگی اور ریاست کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوگا کہ آپ کا مذہب یا عقیدہ کیا ہے کیونکہ یہ تو ذاتی عقیدہ کی بات ہے اور ہم اس بنیادی نظریہ سے آغاز کر رہے ہیں۔"

اس واضح یقین دہانی کے بعد حیرت کا مقام ہے کہ صدرِ پاکستان ایسے ذمہ دار منصب پر فائز محمد اسحاق خان کس بنیاد پر پاکستان کے دو قومی تشخص کی بات کر رہے ہیں اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ جن کی جماعت کے پورکھ تو پاکستان اور قائداعظم ہی کے مخالف نہیں تھے بلکہ اکھنڈ بھارت کے علمبردار تھے۔ صدرِ پاکستان نے آئینِ پاکستان کے سلسلے میں اپنی صوابدید کے حوالے سے من مانی تاویل کر کے قومی تشخص کو قومی اور مسلم تشخص کا ذکر کیا ہے جبکہ پاکستان کے آئین میں پاکستان کے تمام شہری پاکستانی کہلاتے ہیں اور یہ شناخت بین الاقوامی پاسپورٹ پر درج شہریت کے خانہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جس میں بلا امتیاز مذہب و عقیدہ صرف پاکستانی درج کیا جاتا ہے اور دنیا بھر میں پاکستان کے تمام شہریوں کی شناخت مذہبی حوالے سے نہیں بلکہ قومی حوالے سے کی جاتی ہے اور یہ عین اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق ہے جس کا پاکستان بھی رُکن ہے۔ خیال رہے کہ جس قسم کی قومیت کا تصور صدرِ پاکستان بیان کر رہے ہیں ایسا تصورِ قومیت تو اسرائیل ایسی ریاست میں بھی رائج نہیں جو دنیا بھر میں سب سے بڑی اور واحد مذہبی ریاست ہے۔

ہم نہایت افسوس کے ساتھ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہم صدرِ پاکستان کی قومیت کی مبینہ تشریح و توضیح کو کسی بھی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس کی ہر مرحلہ پر شدید مخالفت اور مذمت کرتے رہیں گے کیونکہ کسی فرد اور جماعت کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اپنی من مرضی سے آئین اور نظریۂ پاکستان کی تشریح و تاویل کرتا پھرے خواہ اُس کا منصب کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ اور اب رہی صدرِ پاکستان کی ان ہدایات پر وزیرِ اعظم اور متعلقہ حکام کے عمل درآمد کی بات تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کسی کو بھی ایگزیکٹو آرڈر جاری کرنے کا اختیار حاصل نہیں کیونکہ یہ ایک آئینی مسئلہ ہے۔ اسے

قومی اسمبلی کے فورم اور سپریم کورٹ کے ریفرنس کے بغیر نافذ کرنا آئین، قائداعظم کے نظریۂ پاکستان اور شہریت کے بین الاقوامی تصور کے نہ صرف منافی ہوگا بلکہ دنیا بھر میں وطنِ عزیز کی رُسوائی اور جگ ہنسائی کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے شہریوں میں امتیازی سلوک اور اقلیتوں کو قومی سطح پر دوسرے درجے کے شہری قرار دینے کے جُداگانہ طریقِ انتخاب کے بعد ایک اور سازش تصوّر کیا جائے گا جس کے دُوررس نتائج برآمد ہوں گے جو ملک و قوم کی بقاء اور سالمیت کے منافی ہوں گے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کل یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ غیر مسلم شہری اپنے نام اور لباس بھی اکثریتی شہریوں سے مختلف رکھیں اور اُن کی بستیاں بھی الگ بنائی جائیں اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا تو وطنِ عزیز میں اقلیتوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے گا۔ [جب]کہ پہلے ہی ملک کو بنیاد پرست عناصر کبھی خالص سُنی سٹیٹ بنانے کی باتیں کرتے ہیں، کبھی اہلِ تشیع کو کافر قرار دیتے ہیں، کبھی احمدیوں کو کلیدی عہدوں سے نکال باہر کرنے کی باتیں کرتے ہیں، کبھی مسیحیوں کو امریکی پالیسیوں کا ذمّہ دار قرار دیتے ہیں۔ الغرض وطنِ عزیز میں قومیت کے مسلم اور غیر مسلم تصور سے استحکامِ پاکستان بلکہ بقائے پاکستان کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے لہٰذا پاکستان کے روشن خیال اور قوم پرست طبقوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مذہب کے حوالے سے مبیّنہ قومی تشخص کے حوالے سے قومی شناختی کارڈ پر مذہب کے اندراج کے حوالے سے پیدا ہونے والے محرکات اور عوامل و عواقب کا سنجیدگی سے جائزہ لیں اور صدرِ پاکستان کی غیر آئینی ہدایات پر عمل درآمد کے عمل کی راہ میں دیوار بن جائیں تاکہ پاکستان فرقہ واریت اور امتیازی سلوک کی گہری دلدل میں گرنے سے بچ جائے۔ (پندرہ روزہ شاداب، لاہور۔ ۲۹ فروری ۱۹۹۲ء)

مسیحی برادری میں اتحاد اور یک جہتی کا فقدان کیوں؟

[جناب عنایت ارشد نے "تلخ و شیریں" کے زیر عنوان مسیحی برادری میں اتحاد اور یک جہتی کے فقدان اور جناب جے۔ سالک کے ساتھ ہونے والی زیادتی میں مسیحی سیاسی و دینی رہنماؤں کی طرف سے خاموشی پر اظہار خیال کیا ہے۔ برادری میں یک جہتی کے فقدان کے سلسلے میں ان کے خیالات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔]

"مسیحیوں کی بیشتر آبادی محنت کشوں پر مشتمل ہے۔ ان محنت کشوں کو حالات وواقعات نے تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ ان کی پچاس فیصد آبادی بے روزگاری کا شکار ہے، اس آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ قدرے خوشحال اور مطمئن ہے۔ ان میں ایک تو سیاست دان اور سماجی کارکن ہیں، دوسرے مذہبی پیشوا اور کلیسیاؤں سے منسلک لوگ ہیں۔ تیسرے وہ لوگ جو تعلیم، قانون اور ابلاغِ عامہ کے دیگر ذرائع سے وابستہ ہیں۔ ان تینوں گروہوں کو شمار کیا جائے تو یہ لوگ بڑی مشکل سے آبادی کا ایک فیصد حصہ ہوں گے مگر ستم ظریفی ہے کہ ان تینوں گروہوں نے مسیحیوں کے

پسماندہ طبقات پر اپنی اپنی صوابدید کے مطابق گرفت قائم کر رکھی ہے۔ اور یہ متذکرہ تینوں میدانوں میں غریب عوام کو تگنی کا ناچ نچا رہے ہیں اور غریب عوام کو اتحاد و یک جہتی کا درس دینے کے باوجود ان کو کسی مرحلے پر یک جا نہیں ہونے دیتے۔

سیاست کے میدان میں جُداگانہ طریقِ انتخاب کے باعث ریاست کے اندر ایک چھوٹی سی ریاست قائم ہو گئی ہے۔ جس طرح آج کے دور میں ملکی سطح پر سیاست روپے پیسے کا کھیل بن گئی ہے اسی طرح اقلیتوں کی چھوٹی ریاست میں الیکشن اور نام نہاد نمائندگی نے بھی اسے سرمائے کا پابند بنا دیا ہے۔ حقائق ہمارے سامنے ہیں کہ ہمارے نمائندوں نے الیکشن میں کامیابی عوام کی خدمات کے باعث حاصل نہیں کی بلکہ انہوں نے کامیابی سرمائے، کلیسیائی اثر و رسوخ اور غلط روّیوں کے باعث حاصل کی۔ ان وفاقی اور صوبائی نمائندوں کے اعمال و کردار کا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہمارے نمائندے عوام کو اتحاد اور یک جہتی کا درس تو دیتے ہیں مگر عملی سیاست میں ہر ایک نے اپنی اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنا رکھی ہے اور عوام کو کسی مرحلے پر یکجا نہیں ہونے دیتے اور ایک کے علاوہ یہ تمام کے تمام نمائندے غریب عوام کا حقِ نمائندگی ادا کرنے کی بجائے اپنے اپنے حلقۂ نیابت میں حکومت کی طرف سے دیئے گئے فنڈز کو بے دریغ خرچ کر کے آئندہ الیکشن کے لیے اپنے اپنے قلعے مضبوط کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ راقم کو اسلام آباد میں ایک اجتماع میں وزیرِ اقلیتی امور سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا تو ان سے پوچھنے کی جسارت کی کہ کیا وجہ ہے کہ آپ وزیر ہونے کے باوجود ملک کے دوسرے حصوں میں دلچسپی لینے کی بجائے اپنے شہر تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں تو انہوں نے بغیر کسی جھجک کے برملا کہا کہ ان کے حلقہ میں ۳۵، ۴۰ ہزار کے لگ بھگ ووٹ ہیں جن کے باعث انہیں اپنی توجہ کا محور اپنے حلقۂ نیابت کو بنانا پڑتا ہے۔ وزیرِ اقلیتی امور کے علاوہ اگر ہم دوسرے نمائندگان کی طرف نظر کریں تو ان کے اعمال اور کردار کی روشنی میں بھی ہمیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام حضرات بھی اپنے اپنے شہروں اور آبائی حلقوں میں تعمیر و ترقی کے منصوبے بنا کر عوامی سرمایہ خرچ کر رہے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سرمائے کے کھیل نے ان کو اس قدر بے حس اور سیاسی شعور سے نابلد کر دیا ہے کہ یہ لوگ عوام کی نمائندگی کرنے کی بجائے اپنے اپنے مفادات کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ لہٰذا اس طرح جُداگانہ طریقِ انتخاب نے عوام سے اُن کا حقِ نمائندگی چھین لیا ہے اور ان نام نہاد نمائندوں نے ان کو گروہوں اور ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا ہے لہٰذا اس مرحلے پر اتحاد و یک جہتی کا خواب دیکھنا دیوانے کی بڑ کے مترادف ہوگا۔

کلیسیاؤں میں بھی صورتِ حال مختلف نہیں ہے۔ کلیسیائی رہنما آپس میں دست بہ گریبان ہیں۔ ایک دوسرے کی پگڑی اُچھالنے میں مصروفِ عمل ہیں۔ عوام سے ان کا رابطہ اور تعلق گرجا گھر کی چار دیواری تک محدود ہوتا ہے۔ گرجا گھر سے باہر ان کا تعلق جنازے اور نکاح تک ہے۔ اس کے آگے ان کا عوام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ منبر پر کھڑے ہو کر مذہبی پیشوا بھی بڑے طمطراق سے محبت اور اتحاد و یک جہتی کا درس دیتے ہیں مگر منبر سے اُترنے کے بعد ان کے مشاغل اپنے اپنے حریفوں کو